فیض احمد فیض

پاکستانی ثقافت

[پاکستان ٹیلی ویژن نے ایک زمانے میں موضوعِ سخن کے عنوان سے تقاریر کا ایک سلسلہ شروع کیا تھا۔ ان تقاریر میں پاکستان کی معاشرتی، تہذیبی، ادبی اور علمی زندگی کے مختلف مسائل پر گفتگو کی جاتی تھی۔ اس کے لیے ملک کے مؤقر اور نامور اہلِ فکر میں سے کسی کو دعوت دی جاتی کہ وہ کسی موضوع پر اپنے خیالات کا اظہار فرمائیں۔ اس سلسلے کا آغاز ''پاکستانی ثقافت'' کے موضوع پر گفتگو سے ہوا، جس کے لیے فیض احمد فیض کو مدعو کیا گیا تھا۔ گفتگو کے محرک پروفیسر سیّد وقار عظیم مرحوم تھے۔ زیرِ نظر تحریر، جو اپنے موضوع کے لحاظ سے بھی اہم ہے اور اس اعتبار سے بھی کہ ہمارے دو اکابر ادب اور دانش وروں کے خیالات پر مشتمل ہے۔ طویل مدت کے بعد یہ تحریر پہلی بار بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی، اسلام آباد کے شعبہ اُردو کے شش ماہی علمی و تحقیقی مجلّہ 'معیار' کے جنوری تا جون 2010ء کے شمارے میں شائع ہوئی۔ یہاں اس کو فیض صدی کے حوالے سے 'معیار' کے شکریہ کے ساتھ پیش کیا جا رہا ہے۔]

پروفیسر وقار عظیم:

جنابِ فیض کی ذات کسی تعارف کی محتاج نہیں۔ مَیں رسمی الفاظ استعمال نہیں کر رہا، ان کو یقیناً کسی تعارف کی ضرورت نہیں، ان کے کلام کے مجموعے ملک کے اندر اور باہر ہر جگہ مقبول ہیں۔ ''نقشِ فریادی'' سے لے کر ''سرِ وادیِ سینا'' تک ان کے پانچوں مجموعوں پر مجموعی

حیثیت سے اگر آپ تبصرہ کریں تو یہ ہے کہ موجودہ دور کا طرزِ احساس ان میں بڑے خوش آہنگ انداز میں ایک تفسیر اور تعبیر کا عمل ایک ایسے لہجے میں اس کا اظہار ہوا ہے، جو جناب فیض احمد فیض کا مخصوص اور منفرد لہجہ ہے۔ اس میں نرمی ہے، حلاوت ہے۔ شائستگی ہے، ترنم ہے اور اس کے ساتھ ساتھ کلاسیکی روایت کا رچاؤ اور گھلاوٹ۔ یہ اس لہجے کی خصوصیات ہیں جنہوں نے ان کے کلام کو پاکستان میں بلکہ پاکستان کی حدود سے باہر بھی مقبول اور معروف کیا ہے اور ان چیزوں کی موجودگی میں ظاہر ہے کہ فیض صاحب کے کسی رسمی تعارف کی گنجائش نہیں۔ دوسری بات اس موضوع سے متعلق یہ ہے کہ جب سے پاکستان بنا ہے، ثقافتی اداروں اور ثقافتی مسائل سے اتنا گہرا تعلق رہا ہے فیض صاحب کا کہ جن لوگوں کو حق حاصل ہے ان مسائل پر گفتگو کرنے کا، فیض صاحب کا حق میرے نزدیک ان سب پر فائق ہے۔ انہوں نے رہبری بھی کی ہے اور اس مسئلے پر سوچا بھی ہے۔ ان کی باتیں سننے کے مشتاق بیٹھے ہیں، لوگوں کے ذہن میں جو پیچیدگیاں ہیں وہ دُور ہوں۔ فیض صاحب شاعر کے علاوہ ایک استاد اور معلم بھی ہیں اور استاد اور معلم کا بات کرنے کا خاص طریقہ ہوتا ہے، وہ مسائل کا مشاہدہ کر کے ان کا تجزیہ کرتا ہے اور اُس کو اپنے سننے والے یا پڑھنے والے کے سامنے ایک منطقی انداز میں پیش کرتا ہے۔ آج کے مسئلے کے متعلق بھی مجھے یقین ہے کہ فیض صاحب تجزیاتی اور منطقی انداز میں جو کچھ فرمائیں گے، ان میں ایسی باتیں بھی ہوں گی جنھیں میں فکر انگیز کہوں تو مناسب ہے جو ہمیں سوچ پر مائل کریں گی اور اسی سوچ کا اظہار ان سوالوں کی شکل میں ہوگا جو یہاں تشریف رکھنے والے خواتین و حضرات فیض صاحب سے پوچھیں گے۔ اب میں آپ کے اور فیض صاحب کے درمیان زیادہ حائل ہوئے بغیر آپ سے اجازت چاہتا ہوں اور فیض صاحب سے درخواست ہے کہ وہ تشریف لائیں اور اس موضوع پر اپنے خیالات کا اظہار فرمائیں۔

فیض احمد فیض:

موصوف تو غالب کے طرف دار ہیں، اس لیے جو کچھ انہوں نے فرمایا اگرچہ میں اس کا اہل نہیں ہوں، لیکن شکرگزار ہوں۔ آج سے دو چار دن پہلے جب مجھ سے یہ فرمائش کی گئی تھی کہ مَیں پاکستانی ثقافت اور پاکستانی فنون کے بارے میں آپ سے کچھ عرض کروں تو مَیں نے اس وقت مروت میں ہاں کر دی مگر بعد میں جب اس بارے میں سوچنا شروع کیا تو بہت گھبراہٹ ہوئی۔ اوّل تو اس لیے کہ یہ موضوع اتنا ہمہ گیر ہے کہ ایک گفتگو میں اس کو سمیٹنا بہت مشکل ہے اور کچھ اس وجہ سے کہ اس موضوع پر اتنی باتیں ہو چکی ہیں، گزشتہ بیس پچیس برس میں کہ وہ کون سی نئی بات ہے جو آپ کی خدمت میں پیش کر سکتا ہوں۔ یقیناً مَیں جو کچھ کہوں گا، وہ ایسی باتیں ہوں گی جو آپ اس سے پہلے کئی بار سن چکے ہوں گے۔ سلسلۂ خیر پہلے دن سے ہی جاری ہے لیکن کم از کم دو بار اس پر نہایت طویل گفتگو اور غور ہو چکا ہے۔ یہ ہمارے دوست حفیظ کاردار تشریف رکھتے ہیں۔ ایک بار تو ان کے ساتھ مل کر رپورٹ بھی مرتب ہوئی تھی کوئی دس پندرہ برس پیشتر۔ اس رپورٹ میں اس مسئلے کے مختلف پہلوؤں کا جائزہ بھی لیا گیا تھا۔ پھر اس کے بعد شاید لوگوں کی تشفی نہیں ہوئی۔ اس لیے کوئی سات آٹھ برس پہلے ایک اور کمیٹی بٹھائی گئی جس میں ذرا زیادہ تفصیل سے اس مسئلے پر غور کیا گیا۔ یہاں بانو قدسیہ بھی تشریف فرما ہیں وہ بھی اس کمیٹی کی رُکن تھیں۔ ہم نے اپنی رپورٹ مرتب کرنے سے پہلے پشاور سے لے کر چٹا کانگ تک تقریباً ہر شہر کا دورہ کیا، کوئی تین سو سے اوپر اہلِ دانش، اہلِ فکر اور اہلِ نظر سے گفتگو کی اور اس کے بعد رپورٹ مرتب کی جو اس وقت میرے سامنے ہے۔ اس رپورٹ میں جو کچھ کہا گیا تھا وہ میری، بانو قدسیہ یا کسی اور دوسرے کی ذاتی یا انفرادی رائے نہیں تھی بلکہ جو نتائج اس وقت مرتب ہوئے تھے، وہ اس میں درج ہیں اور ان پر اتفاقِ رائے تھا۔ اور آج بھی جو کچھ مجھے عرض کرنا ہے اور وہ ایک طرح سے خلاصہ ہے، ان آراء کا جو اس زمانے میں ہم نے سنیں اور جو ہمارے سامنے پیش کی گئیں۔ اس رپورٹ میں ان سب کا خلاصہ ہے۔

آج سے دو تین برس پہلے عید ملنے کے سلسلے میں ہم کسی کرم فرما کے گھر گئے تھے وہاں خاتونِ خانہ مجھ سے کہنے لگیں کہ ابھی کچھ دن ہوئے ہمارے ڈرائیور کی بچی کی شادی ہوئی ہے تو مَیں نے اس سے پوچھا کہ بھئی تمہارا داماد کیسا ہے؟ ڈرائیور نے کہا کہ صاحب اچھا ہے کوئی خرابی نہیں۔ اچھا لڑکا ہے۔ لیکن بات یہ ہے کہ سیر ویر یعنی شعر ویر بہت کہتا ہے اور اخباروں اور رسالوں میں چھپواتا بھی ہے۔ بیگم صاحبہ نے کہا، اس میں کیا برائی ہے شعر تو ہمارے فیض صاحب بھی کہتے ہیں، اس نے کہا کہ صاحب ان کی بات دوسری ہے وہ تو امیر آدمی ہیں۔ لیکن ہم لوگوں کے لیے یہ اچھی چیز نہیں ہے۔

کلچر یا ثقافت اور فنون کے بارے میں ایک تو ہمارا تصور یہی ہے کہ یہ تو امراء کی عیاشی کی چیز ہے، وہ کریں تو ٹھیک ہے دوسرے لوگوں کا اس سے کیا واسطہ۔ اسی سے ملتا جلتا مختلف انداز میں ایک مقولہ میں نے کچھ عرصہ پہلے اسلام آباد میں سنا۔ کوئی صاحب وزارتِ خارجہ میں کسی ثقافتی منصوبے کے لیے درخواست لے کر گئے۔ اس کے لیے کچھ پیسہ درکار تھا، وہاں انہیں جواب ملا کہ اگیری کلچر کے لیے ہمارے پاس روپیہ نہیں ہے اور تم کلچر لیے پھرتے ہو، یہ کلچر ولچر رکھو اپنے پاس۔ روٹی، کپڑا اور مکان ضروری چیزیں ہیں اور یہ جو کلچر ہے یہ تو جب پیسہ آئے گا اس وقت دیکھا جائے گا۔ یہ ضروریات پوری کر لیں پھر اس کے بعد کلچر سے نمٹ لیں گے۔ تو بات وہی ڈرائیور والی ہے کہ یہ امیروں کی باتیں ہیں۔

ہم بہو بیٹیاں یہ کیا جانیں

ایک نقطۂ نظر تو یہ ہے کہ ہمارے ملک میں کلچر کا روزمرہ کی زندگی اور ہماری قومی ضرورت سے کوئی قریبی رشتہ نہیں ہے۔ تمام ضروریات اور تقاضے پورے ہونے کے بعد کلچر اور اس سے متعلق باتوں پر غور کیا جائے گا۔ دوسرے نقطۂ نظر کے مطابق ہمارے بعض دوستوں کا خیال ہے کہ دراصل کلچر تو طبقاتی ہوتا ہے یعنی کلاس کلچر۔ ہمارے ہاں امراء ہیں، غربا ہیں، کسان ہیں، سرمایہ دار ہیں اور افسر لوگ ہیں۔ یہ الگ الگ جو طبقے ہیں، کلچر بھی ان کا الگ

الگ ہے۔ مزدوروں کا کلچر الگ، کسانوں کا کلچر الگ، سول لائنز کا کلچر الگ، نوجوانوں کا کلچر الگ، جاگیرداروں کا کلچر الگ اور اس سے ماورا پاکستانی کلچر یا قومی کلچر تلاش کرنا، بیکار سی بات ہے۔ اس لیے کہ کلاس سے الگ کوئی کلچر نہیں ہوتا۔ تو یہ ہوا دوسرا نقطۂ نظر۔ اسی سے ملتی جلتی بات یہ ہے کہ ہمارے نوجوان دوست کہتے ہیں کہ سندھی کلچر ہے، بلوچی کلچر ہے، پختون کلچر ہے، پنجابی کلچر ہے، لیکن یہ پاکستانی کلچر کس چڑیا کا نام ہے؟ ہر جگہ کے الگ الگ کلچر ہیں اور یہی ہونا بھی چاہیے کہ اس سے اوراوپر کسی قومی کلچر یا قومی ثقافت کی تلاش کرنا بیکار ہے۔ ایک اور بات یہ کہی جاتی ہے کہ صاحب ہمارا ملک اسلامی ملک ہے، اس لیے ہمارا کلچر اسلامی ہے۔ اور اسلامی کلچر کے ساتھ پاکستانی کا دم چھلا لگانا یا یہ تلاش کرنا کہ اسلامی کلچر سے ہٹ کر کوئی الگ تھلگ سی چیز ایسی ہے جس کو ہم اپنی مخصوص ثقافت کہہ سکیں یا مخصوص کلچر کہہ سکیں، یہ سب شرارت کی باتیں ہیں۔ اس سے تو یہ مقصود ہے کہ یہاں لادینی پھیلائی جائے۔ سندھی، پنجابی، بلوچی اور پختون کا فساد پیدا کیا جائے اور اس طرح سے قومی وحدت کو نقصان پہنچایا جائے۔ مَیں نے ابھی جو حوالے دیئے ان سے آپ سمجھیں گے کہ مَیں کوئی مبالغہ کر رہا ہوں۔ ایک درسی کتاب کا نام ''اسلامی تہذیب و تاریخ'' ہے جو کہ بتایا گیا ہے کہ بی اے کے نصاب میں ہے، اگر شامل بھی نہیں ہے تو کم از کم اس کے پانچ چھ ایڈیشن چھپ چکے ہیں اور اگر نصاب میں شامل نہیں بھی ہے تو طلبہ کے لیے اس کا مطالعہ غالباً لازمی ہے۔ اس میں یہ لکھا ہے کہ:

۱۔ تہذیب کے معانی اصلاح و تربیت کے ہیں۔ انگریزی میں اس کا ہم معنی لفظ کلچر ہے چنانچہ تہذیب نظریے اور عقیدے کا نام ہے۔

۲۔ یہ تو تہذیب کی تعریف ہوگئی، ''تمدن کسی ملک کی طرزِ معاشرت کا نام ہے۔'' انسان قطعی طور پر معاشرتی طرزِ زندگی اختیار کرتا ہے۔ چنانچہ رشتہ داری، دوستی، ہمسائیگی اور دوسرے تعلقات سب تمدن کی تعریف میں آتے ہیں۔

اوّل یہ غالباً Civilization اور کلچر کو اوپر نیچے کر دیا ہے۔ لیکن اسے چھوڑیے

اب آگے تعریف کرتے ہیں، اسلامی تہذیب اور تمدن کی۔

اسلامی تہذیب کے عوامل پانچ عقائد ہیں جو اجزائے ایمان ہیں۔ پہلا عقیدہ اللہ پر ایمان، دوسرا عقیدہ فرشتوں پر ایمان، تیسرا عقیدہ تمام آسمانی کتب پر ایمان، چوتھا عقیدہ انبیاء پر ایمان اور پانچواں عقیدہ آخرت پر ایمان۔ چنانچہ یہ تو ہو گیا کلچر۔ یہ پانچ عقائد جو ہیں یہ آپ کا عقیدہ ہیں۔ چنانچہ یہ ہی آپ کا کلچر ہے، باقی رہ گئی تہذیب۔ تہذیب اسلامی کے عناصر پانچ رکن ہیں۔ پہلا رکن، اقرارِ کلمہ طیبہ؛ دوسرا رکن، نماز؛ تیسرا رکن، زکوٰۃ؛ چوتھا رکن، روزہ؛ پانچواں رکن، حج۔ اس سے تمام اسلامی کلچر اور تہذیب کا انہوں نے فیصلہ کر دیا، کہیں ساری اس کتاب میں یا اس کے مقدمے میں اس کا ذکر نہیں ہے کہ ادب یا شاعری یا فن یا تعمیرات، آپ کا لباس، آپ کی زبان جو ہے اس کا بھی کوئی تعلق ہے آپ کے کلچر سے، آپ کی تہذیب سے اور اگر یہ بات سچ مان لی جائے تو وہ تمام باتیں جن پر آپ فخر کرتے ہیں یعنی شاعری میں سعدی ہیں، حافظ ہیں، اقبال ہیں، فردوسی ہیں، غالب ہیں اور میر ہیں۔ اور تاج محل ہے اور سمرقند و بخارا ہیں، البیرونی ہیں، ابنِ خلدون ہیں وغیرہ وغیرہ، چنانچہ جو بھی علوم ہیں فنون ہیں جو بھی آپ نے دُنیا کو دکھایا وہ ان صاحب کی نظر میں تہذیب اور کلچر کی تعریف سے خارج ہے اور وہ کہتے ہیں کہ بس یہی ہے اسلامی کلچر۔ کیوں کہ ہم اسلامی مملکت ہیں، اس لیے ہمارا کلچر یہی ہے۔ اس کے علاوہ اور کوئی بات کرنے کی اجازت نہیں۔ مَیں سمجھتا ہوں کہ ایک لحاظ سے ان کا یہ کہنا غلط نہیں ہے، وہ اس طریقے سے غلط نہیں ہے کہ مَیں سمجھتا ہوں وہ چیز وہ عنصر جو اسلامی ممالک میں مشترک ہے اور جس کو ہم صحیح معنوں میں اسلامی کہہ سکتے ہیں جس کا انھوں نے ذکر کیا ہے یعنی ہمارے عقائد جو ہیں وہ ایک ایسی چیز ہیں جو سارے اسلامی کلچر کا دائرہ ہیں۔ اگر آپ اسے مانتے ہیں تو ان معنوں میں ہم اسے تسلیم کیے لیتے ہیں۔ ان معنوں میں کہ مشترک چیز یہی ہمارے عقائد ہیں۔ لیکن اس کو آپ کسی طریقے سے یہ نہیں کہہ سکتے کہ کسی قوم یا کسی ملک کی ثقافت یا کلچر جو ہیں اس پر یہ تعریف پوری طرح محیط ہے۔ آپ

کو ماننا پڑے گا کہ کسی ملک کی اپنی جو مخصوص ثقافت ہے یا جو اس کا اپنا مخصوص مزاج ہے یا اس کی جو مخصوص تہذیب ہے، اس میں ان عقائد کے علاوہ اور بہت سی ایسی چیزوں کا دخل ہے جن کا دین سے کوئی تعلق نہیں ہے جو خالص دنیوی چیزیں ہیں۔ زبان ہے، لباس ہے، غذا ہے، رہن سہن کے طریقے ہیں، رسم و رواج ہیں، ادب ہے۔ ظاہر ہے کہ عقیدے کا ان سب چیزوں پر اثر ضرور ہوتا ہے اور اگر آپ ایک مشترکہ عقیدہ رکھتے ہیں تو آپ کی ثقافتوں میں بھی اشتراک کا ایک عنصر موجود ہوگا لیکن اس اشتراک کے ساتھ ساتھ آپ کو ہر جگہ اپنے اپنے ملک کا، اپنی اپنی قوم کا ایک مخصوص کلچر بھی ملے گا۔ اس کے بارے میں بھی مجھے شاید بعد میں پھر کچھ کہنے کی ضرورت ہو۔

آپ پہلی بات لے لیجیے کہ صاحب ضروریاتِ زندگی جو ہیں پہلے وہ پوری ہو جائیں تو اس کے بعد ہم کلچر کی طرف رجوع کریں گے، مَیں سمجھتا ہوں کہ بات صحیح نہیں ہے۔

دوسرے یہ کہ ثقافت تو ایک عملِ تشخیص کا نام ہے۔ اگر آپ یہ کہیں کہ انسان کو یہ دیکھنے کی ضرورت پیش نہیں آتی کہ میرا خدوخال کیا ہے اور اگر کسی کو اپنے خدوخال معلوم نہیں ہیں تو اس کی ایک طرح سے شخصیت ہی مفقود ہے۔

اسی طرح قومی ثقافت جو ہے وہ تو زندگی سے، قومیت سے، قومیت کے وجود سے یا کسی وطن کے وجود سے الگ چیز تو نہیں ہے۔ وہ تو اس کا ایک داخلی حصہ ہے اور سیاسی اعتبار سے اگر آپ نے اس کا تشخص نہیں کیا اور اسی کا تعین نہیں کیا تو پھر آپ کی قوم کیسے موجود ہے؟ اس وجہ سے سیاسی اعتبار سے لازم ہے کہ اپنے قومی وجود کو مستحکم کرنے کے لیے اس کو دُنیا سے منوانے کے لیے اپنے داخلی وجود کو داخلی طور پر منضبط کرنے کے لیے ہم اپنی ثقافت کو نہ صرف پہچانیں بلکہ اس کی اہمیت کو بھی ایک طرح سے تسلیم کریں، جتنا بھی ممکن ہو اس کی خدمت کریں۔ اگر آپ اقتصادی طریقے ہی لے لیجیے تو پھر بھی یہ کہیں گے جس کے پاس روٹی ہی نہیں ہے، پہلے وہ روٹی کھائے گا کہ گانا بجانا کرے گا، پہلے روٹی کھائے گا اس کے

بعد کچھ اور کرے گا۔ یہ بھی انالوجی جو ہے وہ کچھ ایسی صحیح نہیں ہے کیوں کہ جو غریب ہیں وہ بھی ہر چند کہ ان کے پاس ضروریاتِ زندگی کے لیے کافی مہیا نہیں ہوتا لیکن اس کے باوجود بھی انہیں تفریح کے لیے ضرورت پڑتی ہے۔ کہیں جا کے تھیٹر دیکھ لیا، سینما دیکھ لیا، کبڈی کھیل لی، کوئی نہ کوئی اپنی تفریح کے لیے سامان وہ بھی پیدا کر لیتے ہیں اور وہ یہ نہیں سمجھتے ہیں کہ ان کی اس تفریح میں اور ان کی تلاشِ روزگار میں کسی قسم کا تضاد ہے۔ اسی طریقے سے مَیں سمجھتا ہوں کہ اقتصادی طور سے بھی اگر آپ دیکھ لیں تو اس طریقے سے ایک غریب اور مفلس آدمی بھی اپنی تفریح کسی نہ کسی طریقے سے تلاش کر لیتا ہے۔ تفریح کی ایسی ہی ضرورت ہے جیسی اس کے جسم کو روٹی کی ضرورت ہے۔ اسی طریقے پر اجتماعی طور پر بھی ایسا ہی ہے کہ قوموں کو، یا گروہوں کو، یا معاشرے کو اپنی روح کی تسکین کے لیے ایسی ہی ضرورت پیش آتی ہے کہ ذریعۂ اظہار کی جس طرح اس کو باقی ضروریاتِ زندگی کے لیے پیش آتی ہے۔

تیسری بات یہ ہے کہ آج کل یہ تو تسلیم کر ہی لیا گیا ہے--- انگریز کے زمانے کی بات دوسری ہے--- انگریز کے زمانے میں تو جیسا کہ آپ کو معلوم ہے کچھ محکمے ایسے تھے جن کا تعلق براہِ راست حکومت کے نظم و نسق سے تھا، وہ تو باقاعدہ محکمے سمجھے جاتے تھے جیسے نظم و نسق ہے، مال ہے، مواصلات ہے، لیکن جن کا تعلق قوم کی تربیت سے ہے اور قوم اس وقت ان کی رعایا تھی، ان محکموں کو کہا جاتا تھا Beneficient Department یعنی خیراتی محکمے، تو سمجھا یہ جاتا تھا کہ اگر دوسرے محکموں سے کچھ پیسہ بچ رہا ہے تو یہ خیرات بھی کریں گے، کلچر کا تو خیر اس زمانے میں ذکر ہی نہیں تھا۔ مَیں سمجھتا ہوں کہ تقسیم اور آزادی کے بعد بھی ہماری سوچ میں کچھ اتنا زیادہ فرق نہیں آیا ہے۔ تعلیم اور صحت کو تو ہم نے ایک حد تک مان لیا ہے کہ چلو یہ تو ضروریات ہیں، اس لیے کہ اگر لوگ بیمار اور غیر تعلیم یافتہ ہوں گے تو وہ قومی ترقی میں زیادہ معاون ثابت نہیں ہو سکیں گے۔ اس لیے تعلیم اور صحت کو تو ایک حد تک ہم نے ضرورت سمجھ لیا ہے۔ ضروری تصور کر لیا ہے لیکن کلچر کو تو ہم نے کہیں Beneficient

Department میں بھی نہیں رکھا۔ اس کا کہیں ذکر ہی نہیں ہے۔ جو بھی شعبے ہماری قومی زندگی کے ہیں خواہ وہ ریاستی سطح پر ہوں یا عوامی سطح پر ہوں، ان میں ہم نے ابھی تک یہ تسلیم نہیں کیا کہ جسمانی ضروریات کے ساتھ ساتھ ہماری روحانی ضروریات اور جذباتی اور فکری ضروریات بھی ہیں جو صرف ثقافتی ذرائع سے پوری ہوسکتی ہیں۔ ان کا بھی کوئی ذکر آپ کی منصوبہ بندی میں ہونا چاہیے۔ چنانچہ مَیں اس بات کا قائل نہیں۔ کیوں کہ پہلے آپ کی ضروریاتِ زندگی پوری ہوں، ضرورتیں میسر آئیں، اس کے بعد ہم کلچر جو کہ لہو ولعب کی چیز ہے--- عیاشی کی چیز ہے، اس کی طرف توجہ کریں گے۔ میری ذاتی رائے یہ ہے اور غالباً آپ کو بھی اس سے اتفاق ہوگا کہ زندگی سے الگ کوئی چیز نہیں ہے۔ یہ کوئی ایسا کاروبار نہیں ہے جس کو آپ زندگی سے الگ کرسکیں۔ بلکہ زندگی کے ہر شعبے میں آپ کے کلچر کو آپ کی ثقافت کو جو کہ داخلی طور پر آپ کی اقدار کا نظام ہے اور ظاہری طور پر آپ کے طریقِ زندگی کا نام ہے، آپ کے ہر عمل میں ہر اجتماعی عمل میں کسی نہ کسی طرح اس کا دخل ہوتا ہے اور اگر آپ اس سے چشم پوشی کریں گے تو اس میں کوئی نہ کوئی فتور ضرور واقع ہوگا جو آج کل ہماری قومی زندگی کے مختلف شعبوں میں موجود ہے۔

پھر یہ بھی ہے کہ جس طریقے سے آج کل یہ تسلیم کرلیا گیا ہے کہ تعلیم جو ہے وہ سرمایہ ہے جس طرح Investments ہیں۔ جس طرح آپ کسی اور چیز میں پیسہ لگاتے ہیں اور اس سے پھر آپ کو کچھ یافت ہوتی ہے، اسی طرح سے تعلیم جو ہے وہ اب صرف ایک طرح کی شائستگی کا نام نہیں ہے بلکہ تعلیم بھی ایک Investment ہے، ایک سرمایہ ہے، ایک ذاتی سرمایہ ہے، جس شخص پر بھی آپ یہ سرمایہ لگاتے ہیں، اس شخص میں فکری طور سے، جذباتی طور سے اور دوسرے طریقوں سے اس میں جو مہارت پیدا ہوتی ہے، بصیرت کا اضافہ ہوتا ہے، اس میں جو زیادہ سوجھ بوجھ پیدا ہوتی ہے، اس کی وجہ سے جو بھی وہ کام کرے گا، زیادہ سہولت سے کرے گا، زیادہ بہتر طریقے سے کرے گا، جس کی وجہ سے آپ کے قومی سرمایہ میں اضافہ

ہوگا، اسی طرح جو پیسہ آپ اس میں لگاتے ہیں، وہ خیرات نہیں کر رہے، وہ آپ Investment کر رہے ہیں اور بہتر کارکردگی کی صورت میں آپ کو اس کا منافع مل رہا ہے، تعلیم اور ثقافت کو آپ الگ نہیں کر سکتے اگر تعلیم سرمایہ ہے جس سے آپ کی یافت ہوتی ہے تو اسی کا ایک لازمی حصہ ثقافت بھی ہے، اس طریقہ سے آپ کو اس سے بھی یافت ہوگی۔

بالکل بھی معمولی طریقے سے بات کو اگر سوچیں تو آپ کے ہاں میز بنتے ہیں، کرسیاں بنتی ہیں، یہ سٹوڈیو ہے، روزمرہ زندگی کی اشیاء ہیں۔ آپ کے کارخانوں میں طرح طرح کے استعمال کی چیزیں بنتی ہیں۔ ان میں سے ہر ایک چیز کی تخلیق میں آخر کوئی نہ کوئی تو جمالیاتی عنصر شامل ہوتا ہے۔ کوئی اس کا Design کوئی اس کی Composition، کوئی اس کی صورت، کوئی اس کی شکل اگر آپ کی ان چیزوں کے بنانے والوں کو ان کا سلیقہ نہیں ہے، اگر ان کے ذہن میں کسی قسم کا جمالیاتی ذوق نہیں ہے تو وہ بالکل خراب اشیاء تیار کریں گے۔ مَیں یہ بالکل نیچے کی سطح کی بات کر رہا ہوں اگر آپ ان کو زیادہ تعلیم یافتہ ہونے کے علاوہ زیادہ کلچر یافتہ بنائیں، فنون کے بارے میں ان کے لیے بصیرت کے زیادہ مواقع فراہم کریں گے تو وہ جو کچھ بھی پیدا کریں گے پہلے سے بڑھیا ہوگا۔ اس طریقے سے بھی آپ سوچ لیجیے۔ سرمایہ دارانہ طریقے سے بھی آپ سوچ لیجیے۔ تو بھی اس سے کچھ نہ کچھ آپ کے قومی اثاثے میں اضافہ ہوگا۔ چنانچہ یہ بات بھی غلط ہے کہ آرٹ اور کلچر اور ثقافت اور فن جو ہیں، یہ عیاشی کی چیزیں ہیں۔ ان سے ہمارے قومی اثاثے میں کوئی اضافہ نہیں ہوتا۔ اب یہ قومیتوں کی بات لیجیے، سندھی، بلوچی، پختون اور پنجابی اس سلسلے میں کیا کرنا چاہیے، اس میں دو طرح کے خیالات ہیں، ایک تو یہ اگر ان کو علاقائی ثقافتوں اور ان کے فنون پر زیادہ توجہ کی جائے تو اس سے قومی وحدت کو نقصان پہنچے گا کیونکہ اس طرح کا اندیشہ ہے۔ تو سب وہ لوگ اپنی اپنی جگہ اپنی اپنی بنسری بجائیں گے اور قومی وحدت کو ضعف پہنچے گا۔ اس لیے ضروری ہے کہ صرف ایک پاکستانی ثقافت یا پاکستانی کلچر کا ذکر کیا جائے۔ اور اس سے الٹ بات یہ ہے کہ جب کہ

مَیں نے عرض کیا تھا کہ صرف علاقائی کلچر ہی کلچر ہے اور اس سے بالا یا اس سے ماورا کوئی کلچر نہیں ہے۔

اچھا پہلی بات لے لیجیے تو حقیقت یہ ہے کہ جس کو ہم قومی ورثہ کہتے ہیں یا جسے ہم اپنی قومی ثقافت قرار دے سکتے ہیں، وہ ظاہر ہے کہ اپنی چیزوں کا مجموعہ ہے جو کہ ہمارے ملک میں موجود ہیں۔ سرحد میں جو کچھ موجود ہے، سندھ میں جو کچھ موجود ہے، بلوچستان میں جو کچھ موجود ہے۔ ان سب کے اجتماع سے، ان سب کے اشتمال سے ہی وہ چیز پیدا ہوتی ہے جسے ہم پاکستانی کلچر کہتے ہیں۔ جغرافیائی اعتبار سے اور قومی اعتبار سے بھی۔ اگر قومی اعتبار سے اپنے مختلف علاقوں کے لوگ ہماری قومیت کی تشکیل کرتے ہیں تو پھر اپنے علاقوں کی ثقافت ہماری قومی ثقافت کی تشکیل کیوں نہیں کرتی؟ کہا جاتا ہے کہ نہیں اس لیے کہ ہم تو ایک ہی قوم ہیں، یہ چار کلچر کا کیا سوال پیدا ہوتا ہے جیسا کہ مَیں نے پہلے عرض کیا تھا جو طبقاتی کلچر کے قائل ہیں، وہ کہتے ہیں کہ صاحب ایک قوم نہیں ہے، تین قومیں ہیں۔ دونوں کے دلائل میں بنیادی نقص ایک ہی ہے۔

یہ صحیح ہے کہ جو بھی طبقاتی نظام ہوگا، اس میں ایک قوم کے اندر کچھ سب (sub) قومیں ضرور ہوں گی یعنی جن کو ہم طبقات کہتے ہیں۔ امراء بھی ہوں گے، شرفا بھی ہوں گے، غربا بھی ہوں گے اور اگر آپ کا معاشرہ ان طبقوں میں بٹا ہوا ہے تو آپ کی ثقافت بھی اسی سے مختلف زاویے اور مختلف شکلیں اختیار کرے گی، امراء کا کلچر الگ ہوگا، شہر کے جو کھاتے پیتے لوگ ہیں، ان کا کلچر الگ ہوگا، غربا کا کلچر الگ ہوگا، تسلیم۔ لیکن تین کلچروں کی موجودگی کے یہ معنی نہیں ہیں کہ آپ کی ایک ریاست میں بھی تین ریاستیں ہیں۔ وہ تو ایک ہی ہے، اور اگر ریاست ایک ہے تو ظاہر ہے کہ قوم بھی ایک ہی ہے، اس کے بطن میں۔ اس ایک قومی ثقافت کے بطن میں، مختلف طبقوں کی ثقافتیں ضرور موجود ہوں گی، جس طرح اس ایک قوم کے بطن میں مختلف طبقے اور مختلف گروہ ضرور موجود ہوں گے، لیکن اس کے وجود کو تسلیم کر لینے سے

یہ معنی ہیں کہ ہم قومی وحدت کا انکار کرتے ہیں اور نہ قومی وحدت کو تسلیم کرنے کے یہ معنی ہیں کہ ہم ان کے وجود سے انکار کرتے ہیں۔ قومی وحدت پر اصرار کے یہ معنی نہیں ہیں کہ ہم اس حقیقت کو فراموش کر دیں کہ ایک بلوچی زبان ہے، ایک سندھی زبان ہے، ایک پشتو زبان ہے، ایک پنجابی زبان ہے، گجراتی زبان ہے، اُردو زبان ہے۔ اگر ہم اس حقیقت کو فراموش کر دیں تو پھر ان تمام علاقوں میں جغرافیائی حالات، ان کی تاریخ کی وجہ سے ان کے رسم و رواج میں بھی اختلاف ہے، چنانچہ ان کی ثقافتوں میں بھی امتیاز کیا جا سکتا ہے۔ اگر ہم ان حقیقتوں سے انکار کر دیں تو لازماً ہم ان تعصبات کو ہوا دیتے ہیں جس کے نتیجے میں یہ کہا جاتا ہے کہ پنجابی، سندھی، بلوچی اور پختون تو ٹھیک ہے لیکن پاکستانی کوئی چیز نہیں۔ چنانچہ وحدت کے نام پر ہم انتشار اور اختلاف کو دعوت دیتے ہیں۔ اور دوسری جانب یہ ہے کہ اگر ہم یہ کہیں کہ صرف یہی وحدتیں ہیں، یہی حقیقتیں ہیں اور ملک اور قوم کوئی چیز نہیں ہیں تو وہ بھی غلط ہے۔ اس لیے کہ اگر ہم سب لوگ ایک جگہ رہتے ہیں، اگر ایک ملک کے باشندے ہیں، اگر ایک قوم کے افراد ہیں تو لازمی طور پر اشتراک کی کوئی نہ کوئی صورت تو ہوگی۔ اگر ہم ایک قوم ہیں، ایک وطن ہے تو اس سے بالکل یہ واضح ہے کہ باوجود اس اختلاف کے اشتراک کے اتنے عناصر موجود ہیں کہ اس اشتراک میں جو ذہنی الجھن لوگوں کو ہوتی ہے، وہ یہ ہے کہ لوگ اختلاف کو مخالفت سمجھ لیتے ہیں۔ لوگ فرق کو تضاد سمجھ لیتے ہیں۔ جو فرق ہے، پنجابی اور بلوچ میں وہ فرق ہے، تضاد نہیں۔ اور جو اختلاف ہے بلوچی کلچر اور پنجابی کلچر میں وہ اختلاف ہے مخالفت نہیں۔ یہ بات تسلیم کر لینی چاہیے کہ اختلافات موجود ہیں، فرق موجود ہے اور پھر فرق تسلیم کر لینے کے بعد ہمیں یہ سوچ لینا چاہیے کہ کیا وہ مشترک عناصر کون سے ہیں، وہ مشترک اجزا کون سے ہیں، جن کو تقویت پہنچا کر ہم وحدت کو فروغ دے سکتے ہیں اور انتشار کو روک سکتے ہیں۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ یہ سارے قصے پیدا کیوں ہوئے؟ چنانچہ پاکستانی ثقافت کے سلسلے میں پہلا مسئلہ تو یہ ہے کہ یہ ہمارے ذہن میں جتنے جالے ہیں، پہلے ان کو

صاف کیا جائے۔ یہ جالا صاف کیا جائے کہ کلچر بحیثیت کلچر دین کے خلاف کوئی چیز ہے۔ اس سے دین کا کوئی تصادم نہیں ہے یا یہ طبقات کا جو کلچر ہے، اس کا قومی کلچر کے ساتھ کوئی تصادم ہے۔ پہلے تو یہ جالے اپنے ذہن سے دُور کرنے چاہئیں اور پھر یہ سوچنا چاہیے کہ آخر ۲۷ برس سے ہم جو یہ باتیں کر رہے ہیں آخر یہ جھگڑا ہے کیوں؟

مَیں نہیں سمجھتا کہ دُنیا میں کوئی اور ملک ایسا ہے جسے ایسی الجھن درپیش ہے جیسی ہمیں۔ باقی جو ملک ہیں، جو قومیں ہیں جو کچھ ان کے پاس ہے، اس کو وہ اپنا ورثہ سمجھتی ہیں۔ اسی کے مطابق وہ اپنی ثقافت اور اپنے کلچر کی تعریف کرتے ہیں اور اسی تعریف کی روشنی میں وہ اس کو فروغ دینے کی کوشش کرتے ہیں۔ آخر یہ قصہ ہمیں ہی کیوں درپیش ہے؟

مَیں سمجھتا ہوں کہ اس کی بنیادی وجہ تو صرف وہ حالات ہیں جن میں پاکستان وجود میں آیا تھا۔ آج سے ۲۷ برس پہلے یعنی آزادی سے پہلے کوئی پاکستانی قوم نہیں تھی۔ اس لیے کہ پاکستان ہی کوئی نہیں تھا۔ اس وقت تو یہ تھا کہ ایک طرف ہندی مسلمان تھے اور دوسری طرف غیر مسلم تھے۔ اور اسی طریقے پر لوگ پہچانے جاتے تھے، اپنے علاقے کی رعایت سے یعنی پنجابی، سندھی، بلوچی اور پٹھان وغیرہ۔

جب پاکستان وجود میں آیا تو پاکستان کی جغرافیائی حدیں متعین ہوگئیں، اس لیے کہ وہ علاقہ جو پاکستان کہلائے گا وہ ریاست جس کا نام پاکستان پڑا، اس کا جغرافیائی وجود تو تسلیم ہوگیا۔ اس کے بارے میں کسی کو شک وشبہ بھی باقی نہیں رہا لیکن اس کے اوپر اس کی بالائی منزل تھی یعنی پاکستانی ثقافت، اس کے بارے میں کسی نے فیصلہ نہیں کیا کہ اس کی نچلی منزل کی جو اوپر منزل ہے، اس کے خدوخال کیا ہیں اور اس وجہ سے ہی ہوا کہ اس کی وجہ سے بہت سے جو سوالات پیدا ہوئے تھے۔ اس میں جو وضاحتیں تھیں، ان سے ہم کتراتے تھے یعنی سب سے پہلے تو آپ کو یہ فیصلہ کرنا تھا کہ اگر پاکستانی کلچر کی آپ کو تعریف کرنی تھی، اس کو متعین کرنا تھا تو ہر کلچر کا بھی طول وعرض ہوتا ہے، ضخامت یا گہرائی ہوتی ہے۔

ایک تو یہ کہ آپ اس کی تاریخ کہاں سے شروع کرتے ہیں، تاریخ کو آپ اپنے کلچر کا طول کہہ لیجیے اور جس کو آپ اپنا کلچر کہتے ہیں، اس کی جغرافیائی حدود کہاں تک ہیں۔ اس کو آپ اس کا عرض کہہ لیجیے اور تیسرے یہ کہ جس کو آپ اپنا قومی کلچر کہتے ہیں، اس کی عوام میں رسائی کہاں تک ہے، اس کو آپ کی گہرائی یا ضخامت کہہ لیجیے۔

اب جب پاکستانی کلچر کا سوال پیدا ہوا تو سب سے پہلے تو ہم نے یہ سوچنا شروع کیا کہ اسے کہاں سے شروع کریں۔ موہنجوداڑو سے شروع کریں کہ ٹیکسلا اور گندھارا سے شروع کریں۔ محمد بن قاسم سے شروع کریں، سرسیّد احمد خاں سے شروع کریں، پاکستان ریزولیوشن سے شروع کریں یا ۱۸۵۷ء سے شروع کریں، کیونکہ ہم اس کا جواب نہیں دینا چاہتے تھے۔ اس لیے اس سے ہم ابھی تک اغماض کرتے رہے۔ ہم نے ان کا کبھی جواب نہیں دیا۔ میرے ذہن میں تو اس کا جواب بالکل صاف ہے، اچھا دوسری بات لے لیجیے کہ صاحب ہمارے کلچر کا جغرافیہ کیا ہے؟ ہمارے کلچر میں جو چیزیں شامل ہیں، مثلاً زبان ہے۔ اب اُردو زبان ہے اس کا جغرافیہ تو پاکستان تک محدود نہیں ہے وہ تو ہندوستان میں زیادہ بولی جاتی ہے، وہاں زیادہ علاقے ہیں یہاں تو کم لوگوں کی زبان ہے۔ ہماری کلاسیکی موسیقی وہی ہے جو ہندوستان میں ہے۔ اس پر حد کیسے لگائی جائے؟ یا دوسرا ہمارا پرانا تاریخی ورثہ، اس میں کچھ تو فارسی ہے تو افغانستان اور ایران سے جا ملتا ہے، اس کا رشتہ اُردو کا ادھر جا ملتا ہے۔ چنانچہ ہم عرض کا بھی فیصلہ نہیں کر سکے کہ اس کی جغرافیائی حدود کیا ہیں۔ اس کی وجہ سے ہم نے اس کو گول کر دیا۔ تیسرا مسئلہ یہ تھا کہ ہمارا جو قومی کلچر ہے، اس کی ضمانت کیا ہے۔ یعنی ملک کے کس کس طبقے تک وہ پہنچا ہے، تو پھر وہی دقت پیش آ گئی کہ سرحد کا جو کلچر ہے، وہ الگ ہے، سندھ کا کلچر الگ، بلوچستان کا کلچر الگ، پنجاب کا کلچر الگ۔ چنانچہ ہم نے کسی بات کا جواب اس لیے نہیں دیا کہ ہر بات کا کوئی نہ کوئی سیاسی پہلو ایسا نکلتا تھا، جس کو ہم بالکل [illegible] طریقے سے Face کرنا نہیں چاہتے تھے۔ اس کا سامنا نہیں کرنا چاہتے تھے، میرے

ذہن میں تو یہ بات بالکل واضح ہے کہ قومی ثقافت میں ہر وہ چیز شامل ہے جو کسی سرزمین میں موجود ہے۔ تاریخی اعتبار سے جہاں سے اس سرزمین کی تاریخ شروع ہوتی ہے، اس وقت سے لے کر اس وقت تک جو کچھ بھی فنون، علوم اور ثقافت کی صورت ہے جو کچھ کسی ملک میں موجود ہے، وہ اس ملک کا اس قوم کا سرمایہ ہے۔ اس کا ورثہ ہے اور اس سے کسی طریقے سے شرمانے کی ضرورت نہیں ہے۔

تاریخی اعتبار سے اس سرزمین پر جو کچھ ہے، موہنجوداڑو سے لے کر یہاں تک وہ سب کچھ ہمارا ہے۔ جغرافیائی اعتبار سے پھر میں یہی کہوں گا کہ جو کچھ بھی اس ملک میں کلاسیکی موسیقی ہے، اگر ہندوستان میں بھی ہے تو ہوتی رہے۔ یہاں پر جو ہماری کلاسیکی موسیقی ہے، وہ ہماری ہے۔ وہ ہمارے کلچر کا حصہ ہے۔ پشتو افغانستان میں بھی بولی جاتی ہے اور ہندوستان میں بھی بولی جاتی ہے۔ اس وجہ سے نہ ہم پشتو سے انکار کر سکتے ہیں اور نہ ہی اُردو کو ردّ کر سکتے ہیں۔ کیونکہ یہ تو سیدھی بات ہے کہ کلچر کی حدود اور ریاست یا Politics کی حدود ایک نہیں ہوتیں۔ آپ یورپ کی مثال لے لیجیے۔ یورپی جو ہیں وہ یونانی مجسمے اور یونانی اصنام سبھی کچھ اب تک استعمال کرتے ہیں۔ پھر ایسے ملک بھی ہیں جہاں ایک نہیں تین، چار، پانچ قومیں آباد ہیں۔ وہاں کسی کو یہ الجھن درپیش نہیں۔

انگلستان کے کسی شاعر نے سوچتے وقت یا لکھتے وقت نہیں سوچا کہ میں کیوپڈ کے الفریڈائیے کا ذکر کیوں کر رہا ہوں؟ وہ تو انگریز بھی نہیں تھے، عیسائی بھی نہیں تھے، تو میری شاعری میں ان کا ذکر کیوں آتا ہے؟ وہاں کسی کو اس قسم کی الجھن درپیش نہیں ہے تو ہمیں یہ الجھن کیوں درپیش ہے؟ چنانچہ مَیں یہ سمجھتا ہوں کہ دوسری بات یہ ہے کہ دوسرا مسئلہ یہ ہے کہ ہم جو اپنے کلچر کو چھوئی موئی بنانے کی کوشش کر رہے ہیں کہ اِدھر کسی کا ہاتھ لگ گیا تو یہ خراب ہو جائے گا اور اُدھر کسی سے ہاتھ ٹکرا گیا یا ٹانگ ٹکرا گئی تو گڑبڑ ہو جائے گی یا یہ کہ اس میں یہ جو حصہ ہے، یہ ہمارا نہیں ہے۔ یہ حصہ فلاں کو دے دو، یہ حصہ کسی اور کو دے دو۔ یہ بات میرے

خیال میں ٹھیک نہیں۔ چنانچہ یہ دوسرا مسئلہ ہے جو ہمیں سلجھانا چاہیے۔ ہمارے پاس جو کچھ بھی ہے جتنا بھی تاریخی ورثہ ہے ہمیں اس پر فخر کرنا چاہیے۔ اس تفاخر میں وہ حصہ جو کہ محض تاریخی ہے، اس کو آپ مخلص قومی تفاخر کے لیے استعمال کیجیے۔ یعنی یہ کہ اب موہنجوداڑو کا ہماری موجودہ زندگی سے بہت کم علاقہ ہے لیکن اس کے کچھ ایسے حصے اب بھی ہیں، جو سندھ کے لباس میں آپ کو ملیں گے اور بہت سا حصہ ایسا ہے جس کا آج کی زندگی سے کوئی تعلق نہیں۔ اسی طرح گندھارا آرٹ جو دُنیا کا بہت عظیم جمالیاتی ورثہ سمجھا جاتا ہے، اس کا اس وقت ہماری موجودہ زندگی سے بہت کم تعلق ہے، لیکن اس میں ایک آدھ عنصر ایسا ہے۔ ظروف میں، لباس یا تعمیرات میں جو اب تک زندہ ہے۔ تاریخی ورثے کا جو حصہ محض قومی تفاخر کے کام آئے، اسے تو آپ نمائش گاہ میں رکھیے، اس پر فخر کیجیے اور شرمندہ ہونے کی کوئی ضرورت نہیں۔ جو آج کل زندہ ہے اور ہماری روایات کا حصہ ہے، اس کے بارے میں یہ سوچنا چھوڑ دیجیے کہ یہ ہندوستان میں بھی ہے اور یہ بھی سوچنا چھوڑ دیجیے کہ اگر وہ براہِ راست آپ کے دین سے متصادم نہیں ہے، تو یہ بھی سوچنا چھوڑ دیجیے کہ یہ اسلامی نہیں ہے۔ پنجابی ظاہر ہے کہ اسلامی نہیں ہے، لسی پینے کا اسلام سے کوئی تعلق نہیں ہے یا یہ کہ مَیں نے اس طرح کے کپڑے پہنے ہیں اور آپ نے اس طرح کے۔ اس کا اسلام سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ یہ دنیوی چیزیں ہیں ان کو دنیوی چیزیں سمجھ کر آپ قبول کیجیے۔ یہ وہ دوسرا مسئلہ ہے جس کے بارے میں ہمارے ذہن صاف ہونے چاہئیں۔

اگر ان دونوں باتوں پر ہمارا ذہن صاف ہو جاتا ہے تو پھر تیسرا مسئلہ یہ ہے کہ کاروبارِ زندگی میں ہم نے جو مختلف درجہ تبدیلیاں کر رکھی ہیں، اپنی قومی ضرورت کی، ان میں ہم اپنی ثقافت اور قومی کلچر کو کیا مقام دیتے ہیں۔ تیسرا مسئلہ ہے اس مقام کا تعین جو کہ آپ کی قومی زندگی کی منصوبہ بندی میں ثقافت، کلچر یا فنون کو حاصل ہے۔ مَیں یہ عرض کر چکا ہوں کہ یہ نہ صرف ضروری چیز ہے بلکہ زندگی کی، قومی زندگی کی اوّلین ضروریات میں سے ہے۔ نہریں

کھودنے سے اور کارخانے بنانے سے اور بینکوں کی عمارتیں بنانے سے اس درجہ فائق ہے یہ تو نظریاتی بات ہے۔ اب اس سے آگے مرتب ہوتے ہیں عملی نتائج کہ کرنا کیا ہے؟ اس کے بارے میں بہت سی تجاویز آپ کے سامنے آ چکی ہیں۔ اس رپورٹ کی صورت میں وہ جو حفیظ کاردار صاحب کی رپورٹ تھی، اس کی صورت میں بنیادی طور پر ان کو دو حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ پہلی تقسیم تو یہ ہے کہ ایک تو ہیں فنون یا فنونِ جمیلہ کہہ لیجیے۔ ہاں فنونِ جمیلہ سے مجھے خیال آیا کہ یہ جو فائن آرٹس یعنی فنونِ جمیلہ اور حرفت میں جو تمیز کی جاتی ہے، یہ خالص مغربی چیز ہے اور اس کا بالکل قائل نہیں ہوں۔ جہاں تک فنون یا آرٹس کا تعلق ہے، وہ تو کیوں کہ آزاد پیدا کرتے ہیں۔ ان کے بارے میں تو ہم بیٹھ کر عملی تجاویز پیش کر سکتے ہیں کہ تربیت گاہیں ہونی چاہئیں، درس گاہیں زیادہ ہونی چاہئیں اور آرٹ گیلریاں ہونی چاہئیں۔ آرٹسٹوں کو آج کل رنگ ہی نہیں ملتے، ان کو سہولتیں میسر آنی چاہئیں۔ موسیقاروں کے روزگار کا بہتر انتظام ہونا چاہیے۔ ان کے فن کو لوگوں تک پہنچانے کے لیے زیادہ سہولتیں میسر آنی چاہئیں۔ زیادہ کنسرٹ (Concert) ہونے چاہئیں، زیادہ ہال بننے چاہئیں۔ وغیرہ وغیرہ--- یہ سب ایسی چیزیں ہیں جن کے بارے میں ایسا مشکل کام نہیں ہے۔ یہ جو عملی مسائل ہیں ان پر تفصیلی طور پر بحث بھی ہو چکی ہے۔ ان کی دستاویزی صورت بھی موجود ہے اور وہ حکومت کے پاس موجود ہے۔ صرف جب یہ فیصلہ ہو جائے گا کہ یہ عیاشی کا سامان ہے کہ نہیں ہے اور یہ ضروری چیز ہے کہ نہیں ہے، جب یہ یقین ہو جائے گا کہ اس کی کوئی صورت ہو جائے گی اور یقین اس وقت ہوگا جب ہم یہ تسلیم کر لیں گے کہ اگر کسی شہر میں ایک داروغۂ صفائی رکھ سکتے ہیں، ایک کوتوال پولیس رکھ سکتے ہیں، ایک محررِ چونگی رکھ سکتے ہیں۔ اور باقی ہر طرح کا کوئی نہ کوئی آدمی رکھا جا سکتا ہے تو آپ ایک ثقافتی افسر کیوں نہیں رکھ سکتے جو وہاں ثقافت کا انتظام کرے۔ آپ کے پاس شہر میں اور بہت سی سہولتیں موجود ہیں۔ صرف لاہور اور کراچی کی بات نہیں ہے۔ گوجرانوالہ، وزیرآباد، سیالکوٹ، سمڑ پال اور جتنے قصبے ہیں ہر جگہ ہر طرح کے کارندے

موجود ہیں، تو اب ایک کارندہ اس کا بھی کیوں موجود نہیں ہوسکتا کہ جو یہ کام کر لے وہاں اگر کسی کے پاس کوئی ہنر ہے کوئی فن ہے تو وہ اس کو دریافت کر لے۔ اس کو لوگوں سے روشناس کرانے کی کوشش کرے اور یہ کوشش کرے کہ لوگ جو ہیں ان کو واقعی اشتیاق پیدا ہو اور وہ اس میدانِ عمل میں آئیں۔ اس طرح اگر آپ نے اپنی تعلیم میں اور ہزار طرح کے مضامین شامل کر رکھے ہیں تو کیا وجہ ہے کہ ثقافت کو آپ پہلی جماعت سے لے کر آخر تک اس کی جو مختلف صورتیں ہیں، ان کو آپ اپنے نصابِ تعلیم میں شامل نہیں کر سکتے۔ جب کہ مَیں نے عرض کیا کہ یہ فنون کی بات ہے جس کے مسائل حل کرنے یا اس کے سلسلے میں منصوبہ بندی کرنا کچھ ایسی مشکل بات نہیں ہے۔

لیکن دوسرا مسئلہ جو کلچر کا مسئلہ ہے وہ تو معاشرے کے سیاسی اور اقتصادی ڈھانچے کا مسئلہ ہے۔ اس میں آپ کلچر کی صورت اس وقت تک نہیں بدل سکتے جب تک کہ آپ معاشرے میں ترمیم نہ کریں۔ معاشرے میں اس وقت جو معاشرتی ڈھانچوں کی تقسیم ہے، اس وقت جو شہروں کی اور دیہات کی، امراء کی اور غربا کی، مزارعوں کی اور زمینداروں کی، سرمایہ داروں کی اور مزدوروں کی، یہ جو تقسیم ہے جب تک آپ ان طبقاتی تعلقات میں کوئی ترمیم پیدا نہ کریں، اس وقت تک آپ بنیادی طور پر معاشرے کے اجتماعی کلچر کو تبدیل نہیں کر سکتے۔ وہ مسئلہ سیاست کا ہے، اس میں ہمارا دخل نہیں ہے۔ جو مسائل سیاسی ہیں، ان کا حل بھی سیاسی ہے۔ اس پر ہمیں اس وقت گفتگو کرنا نہیں چاہیے، کیونکہ وہ لمبی بات ہے۔

جو کچھ مَیں نے عرض کیا، اس کا خلاصہ یہ ہے:

اوّل تو ہم قومی سطح پر پاکستانی قومیت اور پاکستانی ثقافت سے شرمانا چھوڑ دیں۔

دوم یہ کہ ہم اسے لہو ولعب یا لادینی سمجھنے کے بجائے اپنی زندگی کا ایک جزوِ اکبر قرار دیں، اور

تیسرے یہ کہ اگر ہم اسے قبول کر لیں تو پھر زندگی میں قومی سطح پر جو بھی منصوبہ

بندی کرتے ہیں جو بھی ہم Priority قائم کرتے ہیں، ان میں ہم اس کی Priority متعین کریں۔ اور آخر میں یہ ہے کہ آرٹ اور کلچر تو کرنے کی چیزیں ہیں، اس کے بارے میں ہم باتیں کم کریں اور کوشش کریں کام ہو۔

سیّد وقار عظیم: خواتین و حضرات جیسا کہ مَیں نے شروع میں عرض کیا ہے کہ کلچر پر گفتگو کا ایک انداز تو یہ ہے کہ اس پر نظریاتی انداز میں باتیں کریں لیکن حقیقت میں پیچیدگیاں اس وقت ہوتی ہیں جب کسی مخصوص معاشرے کے نقطۂ نظر سے کلچر کے مسائل پر سوچنا شروع کرتے ہیں۔ ہمارے لیے یہ مسئلہ اس لیے پیچیدہ ہے کہ ہمارے کلچر کی تاریخ، بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ ۲۷ سال پہلے شروع ہوئی "بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے" یہ مَیں خاص طور پر عرض کر رہا ہوں۔ ۲۷ سال میں کلچر کے متعلق جو مختلف طرح کے خیالات ظاہر کیے گئے اور اب بھی کیے جا رہے ہیں، ان میں باہم اتنا تضاد ہے کہ بعض اوقات آدمی کی سمجھ میں نہیں آتا کہ کس بات کو قبول کرے، کسے رد کرے۔

اسی چیز کی طرف فیض صاحب نے اشارہ کیا ہے کہ یہ جالے ہمارے ذہن میں ہیں۔ اور ان جالوں میں سے بعض کو سلجھانے کی طرف توجہ بھی فرمائی۔ جیسا کہ مَیں نے آپ سے عرض کیا تھا کہ مخصوص حالات کو اس مخصوص رویئے کے مختلف انداز سامنے رکھ کر اُنہوں نے اس مسئلہ پر نظریاتی گفتگو کرنے کی بجائے عملی گفتگو فرمائی۔ آج سب خواتین و حضرات کے ہاتھ میں کاغذ اور قلم ہیں۔ اس کے باوجود کہ مَیں سمجھتا ہوں کہ بہت سی الجھنیں دُور ہوئیں، اور بہت سے جالے ختم ہوئے لیکن کچھ جالے شاید پڑے بھی ہوں۔ فیض صاحب یہاں موجود ہیں، ان کی گفتگو کے دوران جو سوال آپ کے ذہن میں پیدا ہوئے ہوں، آپ براہِ کرم اُن سے پوچھیے۔ مجھے یقین ہے کہ وہ اپنے جوابوں سے آپ کی تشفی فرما سکیں گے۔

سوال: فیض صاحب! آپ نے تقریر کے دوران یہ فرمایا کہ پاکستان بننے سے پہلے ایسی

کوئی چیز نہیں تھی جس کو پاکستانی کلچر کہا جائے اور یہ بھی فرمایا کہ پاکستانی کلچر کی زندگی ۲۷ سال ہے۔ مَیں اس سے اتفاق کرتا۔ میرے خیال میں پاکستانی قوم کو وراثت میں قیامِ پاکستان کے وقت وہ کلچر ملا تھا جس کو برِعظیم کے مسلمانوں کا کلچر کہنا چاہیے۔ Culture of Muslims of the Subcontinent، وہ ہماری inheritance تھی۔ وہ ہمارا کلچر تھا، جب پاکستان بنا۔ ایک تاریخی واقعہ بیان کروں، اس وقت بہت سی وجوہات تھیں جو ہم پیش کرتے تھے، ہندوستان کی تقسیم اور مسلمانوں کے Homeland کو وجود میں لانے کے لیے ان میں سے ایک وجہ یہ بھی تھی کہ ہندوستان کے ہندوؤں کا کلچر الگ اور مسلمانوں کا کلچر الگ ہے تو اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس دعوے پر ہم نے پاکستان کے لیے جدوجہد کی تھی۔ اور وہی کلچر جس کو ہم ہندوؤں سے علیحدہ سمجھتے تھے وہی پاکستانی کلچر تھا؟

جواب: آپ کو کچھ مغالطہ ہوا ہے، مَیں نے یہ عرض نہیں کیا تھا کہ پاکستانی کلچر صرف ۲۷ سال پرانا ہے، مَیں تو اس بات پر زور دے رہا ہوں کہ پانچ ہزار برس پرانا ہے۔ مَیں کہہ رہا تھا کہ کیوں کہ پاکستان کے نام کا کوئی ملک نہیں تھا، اس طرح پاکستانی قوم کے نام سے کوئی قوم موجود نہیں تھی۔ اس ملک کے وجود میں آنے سے پہلے اس لیے ہر چند کہ کلچر تو موجود تھا اور بہت زمانے سے موجود تھا، لیکن وہ صرف پاکستان کا کلچر نہیں تھا، ہندی مسلمانوں کا کلچر بھی تھا جس میں ہندوستان کے مسلمان بھی شریک تھے اور پاکستان کے مسلمان بھی۔ جب پاکستان بن گیا تو اس کلچر کے علاوہ جو ہندوستانی مسلمانوں کے ساتھ ہمارا مشترک کلچر تھا، اس کے علاوہ اس علاقہ میں کچھ اپنی منفرد چیزیں بھی تھیں جو کہ پاکستان میں نہیں تھیں یعنی یہاں سندھ میں جو کچھ رسم و رواج ہے، وہ باقی بھارت میں موجود نہیں، حالانکہ وہاں مسلمان موجود ہیں۔ یہاں بلوچیوں کا، سندھیوں کا، پٹھانوں کا جو طرزِ معاشرہ ہے، وہ باقی بھارت میں موجود نہیں۔ حالانکہ وہاں مسلمان موجود ہیں۔ یہاں بلوچیوں کا، سندھیوں کا، پٹھانوں کا جو طرزِ معاشرہ ہے، وہ انہی سے مخصوص ہے، چنانچہ میں یہ عرض کر رہا تھا کہ جو چیز اس علاقے میں مخصوص

ہے، وہ ہمارا کلچر ہے۔ اس کی ابتداء پانچ ہزار سال پہلے کی ہے۔ اس میں بعد میں بہت سے ایسے اجزا شامل ہوئے جن میں کچھ ہندوستانی مسلمانوں کے ساتھ مشترک ہیں۔ کچھ وسط ایشیاء کے مسلمانوں کے ساتھ مشترک ہیں، کچھ اور جو ہمارے ہمسایہ ممالک ہیں، ان کے ساتھ مشترک ہیں، لیکن اس اشتراک کے ساتھ ساتھ ایسے اجزاء بھی ہماری ثقافت میں موجود ہیں جو ہم سے مخصوص ہیں، صرف اس سرزمین کے ساتھ مخصوص ہیں اور وہ ۲۷ ہزار سال پرانے نہیں ہیں وہ پانچ ہزار سال پرانے ہیں۔ مَیں نے یہ ہرگز نہیں کہا تھا کہ ۲۷ سال پہلے پاکستانی کلچر کا وجود نہیں تھا، کلچر کا وجود تھا، لیکن اس کا نام پاکستانی کلچر نہیں تھا۔

سوال: فیض صاحب! فنونِ لطیفہ سے متعلق مجھے ایک سوال کرنا تھا۔ پاکستان بننے سے پہلے ہمارے ہاں تھیٹر کی روایت کم تھی، مصوری کی روایت تھی اور موسیقی کی روایت تھی، وہ کلاسیکی موسیقی کی صورت میں بہت بڑی روایت ہمارے ورثے میں تھی۔ یہ کیا وجہ ہے کہ تھیٹر کو ترقی ہوئی، مصوری کو ترقی ہوئی لیکن ان مصوروں کو جنھوں نے مغربی انداز میں تصویریں بنانا شروع کی ہیں اور موسیقی کو باقاعدگی کے ساتھ تنزل مل رہا ہے۔

جواب: مَیں عرض کرتا ہوں، میرا خیال ہے کہ آپ لاہور کی وجہ سے کہہ رہے ہیں کہ تھیٹر کو ترقی ہوئی ہے، ورنہ تھیٹر کو ترقی نہیں ہوئی ہے۔ اس لیے آج سے تیس چالیس برس پہلے جب ہمارا طالب علمی کا زمانہ تھا تو یہاں ایک بہت ترقی یافتہ تھیٹر موجود تھا، لیکن جب سے ٹاکیز فلمز شروع ہوئی ہیں، تو اس کا وجود ختم ہو گیا۔ ان کے بعد یہ اس وقت جو یہاں بہت سے شوقین نوجوان کھیل اور ڈرامے کرتے ہیں، یہ تو آٹھ دس برس پہلے کی بات ہے کہ اس کا سلسلہ بھی ہم نے یہیں شروع کیا تھا۔ یہ آپ صحیح فرما رہے ہیں کہ اس حد تک اس میں ترقی ضرور ہوئی ہے کہ آج بہت سے گروہ ایسے موجود ہیں۔ جہاں تک مصوری کا تعلق ہے، آپ فرما رہے ہیں کہ ہماری قدیم مصوری کو فروغ نہیں ہوا۔ مغربی مصوری کو ہوا، اس کی وجہ یہ ہے کہ ہماری قدیم طرز کی جو مصوری تھی، اس کے ایک خاص طرح کے قدردان تھے، ان کی وجہ سے وہ

تصویریں بنائی جاتی تھیں۔ ان میں دو طرح کے مضامین ہوتے تھے یا تو مرقعے ہوتے تھے۔ شبیہیں ہوتی تھیں، نوابوں کی یا ان میں مذہبی مضامین یا افسانوی مضامین کی تصویر کشی کی جاتی تھی۔ ظاہر ہے کہ جب یہ طبقہ ختم ہوا تو مصوری کی یہ صورت بھی ختم ہو گئی۔ اس کے بعد لازم تھا کہ کوئی نہ کوئی نئی صورت پیدا ہوتی۔ کیونکہ ہمارے ہاں انگریزوں کی حکومت کی وجہ سے اس فن کو ترقی نہیں ہوئی، اس لیے لازمی طور سے ہمارے نوجوان جو تھے انہیں مغرب کی طرف رجوع کرنا پڑا اور اب بھی یہ ہے کہ اگر ہم مصوری کی کوئی اپنی مخصوص روش اختیار نہیں کریں گے تو ہم اُن ہی کی نقل کرتے رہیں گے۔ اس کی وجہ تو یہ تھی رہا موسیقی کا سوال اس کے بارے میں بدقسمتی سے ہمارے ہاں ایک خاص طرح کا تعصب پیدا ہوا جس کا تعلق موسیقی سے نہیں تھا بلکہ اس طبقے سے تھا یا موسیقی کی اس صورت سے تھا جو خاندانِ مغلیہ کے زوال کے وقت برصغیر میں پیدا ہوئی۔ ہوا یہ کہ جب---

سوال: معاف کیجیے گا، آپ نے فرمایا کہ مغلیہ خاندان کے زوال کے وقت؟

جواب: زوال کے وقت ہے۔

سوال: یا اس کے بعد؟

جواب: اور اس کے بعد، اس وقت اور اس کے بعد۔

سوال: اس وقت تو یہ معاشرے کا بہت معزز حصہ تھا؟

جواب: اس کے آخری دَور میں ہوا یہ کہ یہ فن جو تھا چند ایک بڑے اساتذہ کو چھوڑ کر ایک ایسے طبقے کے ہاتھ میں چلا گیا جو معاشرتی اعتبار سے کوئی موقر طبقہ نہیں تھا، پھر یہ جب اس طبقے میں گیا تو اس کی صورت بھی ایسی ہو گئی کہ جو سنجیدہ لوگوں کے لیے زیادہ پسندیدہ نہیں تھی، اس کے بعد انگریز آ گئے تو ظاہر ہے کہ جو کسر رہ گئی تھی، ان کی وجہ سے پوری ہو گئی۔ چنانچہ موسیقی نام ٹھہرا مجرے کا اور کچھ گھٹیا قسم کی عیاشی کا، دل لگی کا۔

سوال: وہ تو اب بھی باقاعدگی سے جاری ہے۔

جواب: وہی تو عرض کرنے لگا تھا کہ اب اس کے بارے میں ہمارا نظریہ صحیح ہو جانا چاہیے تھا۔ ہمیں چاہیے تھا کہ اس کے بارے میں اس طرح سوچیں کہ موسیقی جو ہے وہ ایک نہایت سنجیدہ، شائستہ اور موقر فن ہے۔ اگر اس فن کو بعض پیشہ ور لوگوں نے اور ایسے لوگوں نے جو اس کی خوبی اور نفاست سے واقف نہیں تھے، اگر انہوں نے اس کو بدنام کیا ہے تو طویلے کی بلا بندر کے سر نہیں جانی چاہیے۔

سوال: فیض صاحب! مَیں آپ کو یاد دلاؤں کہ وہ پہلی رپورٹ جس کا آپ نے ذکر فرمایا ہے۔ جب اس کی ترتیب ہو رہی تھی تو سوال پیدا ہوا تھا کہ کیا کلچر کی تعریف نہیں کی جا سکتی ہے اور فیصلہ ہوا تھا کہ کلچر کی تعریف کی جا سکتی ہے مگر ساتھ ہی ساتھ یہ فیصلہ بھی ہوا تھا کہ کلچر کی Functional تعریف ہو سکتی ہے۔ مَیں صرف یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ یہ اختلافات اور تضادات جو آپ بتاتے ہیں کیا یہ اسی لیے ہیں کہ کلچر کو تمام دُنیا میں (National Identity) کے لیے استعمال کیا جاتا ہے اور یہاں جن لوگوں کے ذہنوں میں یہ سوال اُٹھتا ہے کہ کلچر کی کیا تعریف ہے، کیا function ہے، ان کے سامنے یہی مسئلہ ہے کہ اگر ہم کلچر کی تعریف کر لیں تو ہم اپنی National Identity کو سامنے لا سکتے ہیں اور اس کو فروغ دے سکتے ہیں کیوں کہ اس کے بغیر پاکستان کی بنیادیں مضبوط نہیں ہو سکتیں۔ آپ نے یہ بھی فرمایا کہ علاقائی کلچرز جو ہیں، ان میں تضادات کو اختلاف یا فرق کہتے ہیں، تضاد نہیں۔ اس فرق کو تضاد میں تبدیل نہ ہونے دیا جائے، اس کا آپ کے پاس کیا حل ہے؟

جواب: صاحب! اس کے لیے کوئی ایسا نسخہ تو آپ کے پاس نہیں ہے کہ تھوڑا سا پشتو ڈال دیں، تھوڑا سا بلوچی ڈال دیں، تھوڑا سا سندھی ڈال دیں۔ وہ تو ایک ایسی چیز ہے جو ارتقائی چیز ہے۔ پہلے ایک اصول طے کر لیا جائے، ایک راستہ متعین کر لیا جائے، ایک سمت متعین کر لی جائے۔ مثال کے طور پر سندھ میں کسی نے لال شہباز قلندر گا لیا تھا، وہ گیت نہ صرف سارے پاکستان میں مقبول ہو گیا، بلکہ پاکستان سے باہر آسٹریلیا تک وہ گیت گایا جاتا ہے۔

اب بلوچستان سے کوئی بڑا فنکار آتا ہے۔فیض بلوچ، مثال کے طور پر آتا ہے تو ایسا ہی محسوس ہوتا ہے جیسے یہاں کا کوئی فنکار ہو، اس طریقہ سے یہاں سے کوئی ہمارا اچھا فنکار مثال کے طور پر امانت علی خان تھے یا شریف خاں پونچھ والے ہیں یا عوامی فنکاروں میں سے عالم لوہار ہیں یا سائیں اختر حسین ہیں وہ کہیں جا کے گایں تو سب لوگ سنیں گے۔ایک ترکیب تو یہ ہے کہ یہ جو صورتیں ہیں ہمارے فن کی، ان کو ایک دوسرے سے روشناس کرانے کے لیے زیادہ سے زیادہ سہولتیں فراہم کی جائیں۔ دوسرے یہ کہ ان کے مشترک اجزاء کو تحقیقی انداز میں تلاش کر کے لوگوں کے سامنے شعوری طور پر پیش کیا جائے۔ تیسری یہ کہ جو اہلِ فکر لوگ ہیں انہیں اس بات پر آمادہ کیا جائے کہ وہ اس سلسلے میں کسی نقطۂ نظر پر متفق ہو جائیں اور پھر کچھ عرصے کے بعد مَیں یہ سمجھتا ہوں کہ اس کے نتائج آپ کے سامنے آ جائیں گے۔ اس لیے کہ یہ کوئی ایسا نسخہ نہیں کہ فوری طور پر اس کو کسی کے سامنے پیش کیا جا سکے لیکن پہلے تو یہ متعین کرنا چاہیے۔ مَیں سمجھتا ہوں کہ اس صورت میں یہی کہ زیادہ سے زیادہ تبادلے ہوں، ان میں جو چیزیں مشترک ہوں، ان پر زیادہ زور دیا جائے۔ وضاحت کی جائے، تشکیل کی جائے، ان کو لوگوں کے سامنے پیش کیا جائے۔

سوال: آپ نے فرمایا کہ ہمیں حال کے کلچر کو فروغ دینا چاہیے۔ اب حال کے کلچر میں ایسے عناصر بھی شامل ہو گئے ہیں، جن کو بیرونی کہا جا سکتا ہے۔ ان کے متعلق اب آپ کی کیا رائے ہے، کس طرح اس فروغ کو ضروری طور پر روکنا چاہیے۔ کیوں کہ اس کا Capitalist ملکوں سے بڑا تعلق ہے، اس پر کتابیں لکھی جا چکی ہیں کہ یہ جو ہپی لوگ آتے ہیں، ان کو خاص طور پر اس لیے بھیجا جا رہا ہے کہ Third World کے جو نوجوان ہیں، وہ اسی طرح کے انداز میں آ جائیں اور کام کرنا چھوڑ دیں۔

جواب: صحیح ہے، مجھے پورا اتفاق ہے آپ سے، عرض یہ ہے کہ اگر یہ جو بیرونی اثرات ہیں، ان کا نفوذ بڑھ رہا ہے، ہمارے ہاں۔ تو کیوں بڑھ رہا ہے، اس لیے بڑھ رہا ہے کہ ہم

نے اپنے ہاں ثقافت اور فن کو کوئی مقام نہیں دیا۔ اگر ہم نے اپنے ہاں قبول کیا ہوتا کہ یہ ہماری ثقافت ہے، یہ ہمارا موقف ہے اور یہ اس کی صورت ہونی چاہیے اور اس کو معتبر طریقے سے لوگوں کے سامنے پیش کیا ہوتا تو لازمی طور پر ان بیرونی اثرات کا زور اتنا نہیں بڑھتا اور اب اگر آپ چاہتے ہیں کہ نفوذ جو ہے، ہمارے ہاں حملہ ہی ہے، ایک طرح کا اس جارحیت کو کم کیا جائے تو یہ نہیں کہ اس کو بند کر دیں، بلکہ اپنی کوئی متبادل صورت پیدا کریں، لوگ گنگنائیں گے تو ضرور۔

سوال: میرے خیال میں کلچر کے بارے میں یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ کلچر کسی قسم کا روّیہ ہوتا ہے اور یہ ایک مسلسل عمل ہوتا ہے، جیسے دریا بہتا جاتا ہے، اسی طرح ثقافت بھی بہتی جاتی ہے۔ اونچے نیچے میدان میں، کبھی پہاڑوں پر سے گزرتی ہوئی اور ایک خاص نشان پیچھے چھوڑتی جاتی ہے۔ اب پاکستانی قوم کے لیے پاکستانی کلچر کے لیے بار بار ہم لوگ ایک ترکیب استعمال کرتے ہیں کہ اس کلچر کو فروغ دینا چاہیے۔ یہ بات مجھے بہت مضحکہ خیز معلوم ہوتی ہے، کلچر کو فروغ دینے کا مطلب یہ ہے کہ ہمارے پاس کبھی کوئی ثقافت نہیں تھی۔ اور اب ہم نے کہیں سے اچانک کوئی چیز Discover کر لی ہے اور اب ہم چاہتے ہیں کہ اس کو پھلنے پھولنے دیں۔ کیا آپ کے نزدیک یہ کہنا درست ہے کہ ہم اپنے کلچر کو فروغ دیں کہ یا یہ جو کلچر ہمارا تھا اگر کسی طرح اس کی ہم نشاندہی کر سکیں اور کہیں کہ اس کو زندہ رکھنا ضروری ہے۔ وقت کے تقاضے کے ساتھ ہمکنار کرنا ضروری ہے۔ اس کو آگے بڑھانا ضروری ہے، اگر فروغ دینے سے یہی مطلب ہے تو میرا سوال بے کار ہے اور اگر فروغ دینے سے یہ مطلب ہے کہ ہم شعوری طور پر کوشش کریں اور کوئی کلچر اپنائیں تو یہ بات مجھے بالکل غلط لگتی ہے۔ آپ کا اس بارے میں کیا خیال ہے؟

جواب: مَیں نے عرض کیا کہ کلچر میں دو اجزا ہوتے ہیں، دو پہلو ہوتے ہیں۔ ایک تو یہ ہے جسے ہم فنون یا Arts کہتے ہیں۔ وہ تو ایسی چیز ہے جسے ہم فروغ دے سکتے ہیں وہ ارادی چیز

ہے، وہ افراد پیدا کرتے ہیں اور انہیں فروغ دینے کے لیے آپ کو بعض چیزیں کرنی پڑتی ہیں، ورنہ وہ ختم ہو جاتے ہیں۔ یا ان میں خرابی واقع ہو جاتی ہے۔ کلچر کا یہ ایک حصہ ہے اور بہت ضروری حصہ ہے اور جیسا کہ مَیں نے عرض کیا تھا کہ آپ اس کو شعوری طور پر فروغ دے سکتے ہیں اور دینا چاہیے، اس کے لیے آپ کو نئی صورتیں وضع کرنی پڑیں گی اور موجودہ صورتوں میں ترمیم بھی کرنی پڑے گی۔ ممکن ہے کہ بعض پرانی صورتیں دوبارہ رائج بھی کرنی پڑیں۔ وہ تو ایک شعوری فعل ہے، باقی جو کلچر ہے جسے آپ کہتے ہیں کہ رویے کا نام ہے، زندگی کا نام ہے، تو طرزِ زندگی کا نام ہے، تو وہ، تو مَیں نے عرض کیا تھا کہ وہ ایسی چیز ہے جو معاشرے کی پوری اجتماعی زندگی کے ساتھ وابستہ ہے۔ جیسے ہی وہ زندگی بدلے گی، ویسے ہی اس کی صورت بدلے گی، اس کو اگر آپ بدلنا چاہیں تو اس کے لیے آپ کو معاشرے کی صورت بدلنی ہوگی۔ اس کو آپ الگ طریقے سے نہیں بدل سکتے۔ اس پر مجھے آپ سے اتفاق ہے۔ اگر آپ یہ کہیں کہ ہمیں اپنے کلچر کو فروغ دینا ہے تو اس کے لیے تو آپ کو اپنے معاشرے کو فروغ دینا ہوگا۔ اس میں جو خرابیاں ہیں، وہ دُور کیجیے۔ اس کے بعد اس میں جو خرابیاں ہیں، پریشان خیالی ہے، وہ خود بخود دُور ہو جائے گی۔ لیکن فنون کا مسئلہ مختلف ہے، اس کو آپ شعوری طور پر فروغ بھی دے سکتے ہیں اور اس کی صورتیں بھی تبدیل کر سکتے ہیں۔

سوال: - ہمارے ہاں تہذیب اور کلچر کا فرق ہے، مَیں سمجھتا ہوں کہ اس میں کوئی بنیادی فرق نہیں ہے۔ تہذیب جو ہے وہ کلچر کی ظاہری صورت ہے یعنی کلچر جو روزمرہ ہے۔ آپ کی زندگی تھا، اس کا اظہار آپ جن صورتوں میں کیا کرتے ہیں۔ فنونِ لطیفہ کی صورتوں میں، مختلف علوم کی صورتوں میں فنون کی صورتوں میں، اس کی متشکل جو صورت ہے اس کو مَیں سمجھتا ہوں کہ Civilization کہتے ہیں۔ مَیں تو تہذیب کو کلچر ہی کے معنوں میں استعمال کرتا ہوں۔ اس لیے کہ مجھے کوئی خاص فرق اس میں دکھائی نہیں دیتا۔ کلچر کو اگر طرزِ زندگی کے معنوں میں استعمال کیا جائے تو تمدن کہنا چاہیے۔ لیکن یہ تو محض الفاظ کی بحث ہے، مَیں سمجھتا ہوں کہ

خاص فرق نہیں ہے۔ مَیں سمجھتا ہوں کہ اگر ہم کلچر اور Civilization کو الگ کرنا چاہیں تو کلچر طرزِ زندگی کا نام ہے۔ اور اس کی جو متشکل صورتیں ہیں، مختلف قسم کی، ان کو ہم Civilization کہتے ہیں۔

سوال: آپ نے حکومت کی یہ کوتاہی بیان کی ہے کہ اس نے ثقافت کو وہ درجہ نہیں دیا جو اسے دینا چاہیے تھا۔ مثال کے طور پر نصاب میں کوئی ایسی چیز شامل نہیں ہے یا کوئی اس کی منسٹری الگ نہیں یا اس کے کوئی عہدہ دار نہیں۔ آپ کے خیال میں حکومت کو کہاں تک اس میں مداخلت کرنی چاہیے، کیوں کہ حکومتِ وقت تو بالآخر ایک جماعت کی ہوتی ہے؟

جواب: بات یہ ہے کہ اگر آپ ذرا تاریخ پر نظر ڈالیں تو یورپ میں یہ ہوا تھا کہ جب فیوڈل نظام کا زوال ہوا، جو لوگ کلچر کے مربی اور سرپرست تھے جب ان کا زوال ہوا تو ان کے بجائے ایک دوسرا طبقہ پیدا ہوا، جس کو ہم سرمایہ دار طبقہ کہتے ہیں اور اس نے فن کی قدردانی کی ذمہ داری سنبھال لی۔ چنانچہ حکومتوں کو زیادہ دخل دینے کی ضرورت پیش نہیں آئی۔ اس لیے صاحبِ ثروت طبقہ تھا، جنہوں نے تھیٹر بنائے، گیلریاں بنوائیں، آرٹسٹوں آرٹ، مالِ تجارت بنا دیا اور بیچنے لگے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ پرانے فیوڈل آرٹ کی جگہ ایک نیا آرٹ ان کے ہاں پیدا ہوا اور اس کے قدردان پیدا ہو گئے۔ ہمارے ملک میں بدقسمتی سے جو پرانا طریقہ تھا اور جو قدردان اور مربی تھے، جاگیردار تھے، نواب تھے، ان کی جگہ سرمایہ دار پیدا نہیں ہوئے۔ انگریز پیدا ہو گئے اور انگریزوں نے کہا کہ یہ تمہارا آرٹ، کلچر بکواس ہے۔ آرٹ اور کلچر سب ہمارے پاس ہے، اس لیے تم ہمارا کلچر سیکھو، اپنا سب کچھ بھول جاؤ۔ نتیجہ یہ ہوا کہ سو ڈیڑھ سو سال میں جو کچھ ہمارے پاس تھا، وہ سب ضائع ہو گیا۔ اب جب ہمیں آزادی ملی تو پبلک میں سے ایسا کوئی طبقہ ہمارے پاس موجود نہیں تھا جو اس کی ذمہ داری سنبھال لیتا، نتیجہ یہ کہ لازماً یہ ذمہ داری حکومتوں پر آ گئی وہ جس حد تک اس سے عہدہ برآ ہوئے یا نہیں، وہ آپ خود فیصلہ کر لیں لیکن موجودہ صورتحال میں جب تک ہماری پبلک میں

اتنے ذرائع نہیں کہ وہ اس کی پرورش کا انتظام کر سکیں۔ اس وقت تک لازماً ہمیں حکومت سے رجوع کرنا پڑے گا، اس کے سوا چارۂ کار کیا ہے؟

سوال: عوامی سطح پر بھی کام ہو سکتا ہے؟

جواب: اب عوامی سطح پر ایک حد تک کام ہو سکتا ہے اگر آپ ڈرامہ کرنا چاہیں گے، تھیٹر کی ضرورت ہوگی۔ اس لیے پیسے کون دے گا؟ اگر عوام پیسے دینے کو تیار ہیں تو ظاہر ہے کہ ہاتھ پھیلانے کی ضرورت نہیں، لیکن ابھی تک عوام میں کوئی ایسا طبقہ نہیں ہے جو اس کی کفالت کر سکے۔ مَیں سمجھتا ہوں کہ یہ ایک عبوری دور ہے، اس میں تھوڑے عرصے کے بعد جب کہ وسائل مہیا ہو جائیں گے تو خود بخود عوام، پبلک اور ایک ایسا طبقہ پیدا ہو جائے گا جو اس کی کفالت بغیر مدد کے کر سکے گا لیکن اس وقت میں سمجھتا ہوں کہ ایک حد تک اس کی ضرورت ہے۔ پھر دیکھیے جو ترقی یافتہ ملک انگلستان ہے تھیٹر بھی موجود ہے، پبلک بھی موجود ہے۔

سوال: ہماری ثقافت میں جو چیزیں پانچ ہزار سال پرانی ہیں، ان کو Preserve کرنے کے بارے میں کیا ہو رہا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ ہمارا دوسرا ثقافتی سرمایہ بھی ہے، جس کا ابھی ذکر ہوا ہے، اس کو بھی محفوظ کرنا ضروری ہے۔ ضرورت ہے کہ کوئی انسٹی ٹیوٹ ہو، کیا اس کے قیام کا امکان ہے؟

جواب: بجا ہے، ایسی ایک چھوٹی سی کوشش تو کی گئی ہے۔ اسلام آباد میں ہم نے ایک ادارہ قائم کیا ہے، Folk Heritage کا۔ اس کا ایک چھوٹا سا سیل یہاں بھی بنا ہے۔ کلاسیکی موسیقی کو فروغ دینے کے لیے۔ مجھے آپ سے پورا اتفاق ہے۔ بدقسمتی سے ایک خرابی یہ ہے کہ ڈیڑھ اینٹ کی مسجدیں بہت سی ہیں، جس سے کوشش اور پیسے کا زیاں ہوتا ہے۔ ریڈیو بھی وہی کام کر رہا ہے، ٹیلی ویژن یہی کام کر رہا ہے۔ محکمہ اطلاعات اور محکمہ تعلیم بھی وہی کام کر رہے ہیں، صحت کے محکمہ میں بھی وہی کام ہو رہا ہے۔ تمام چیزیں بکھری ہوئی ہیں۔ ان کو یک جا کر کے بہترین نتائج پیدا ہو سکتے ہیں اور وسائل کی کمی کی شکایت بھی دُور ہو سکتی ہے۔ اگر

صاحبِ ثروت اشتراک سے کام کریں تو یہ کام بہتر طریقے سے ہو سکتا ہے۔

سیّد وقار عظیم

خواتین و حضرات!

حکایت بڑی لذیذ، لطیف تھی، اس لیے اس نے طول کھینچا اور ابھی اور گنجائش تھی۔ طول کھینچنے کی لیکن ہر حال ہم نے چند حد بندیاں کی ہیں۔ زندگی میں تمام چیزوں کی اور اس لیے مجھے اکبر کا شعر یاد آ رہا ہے۔ ایسے موقعوں پر اکثر یاد آتا ہے۔ جو فلسفی کی الجھن کے بارے میں ہے کہ جوں جوں خدا کو ڈھونڈتا ہے، ڈور کا سرا الجھتا جاتا ہے۔ آج کی بحث کے بارے میں مَیں یہ نہیں کہوں گا کہ ڈور کا سرا نہیں ملا یا الجھ کر رہ گئی، ڈور کا سرا ملا ہے اور مَیں سمجھتا ہوں کہ وہ سرا یہ ہے کہ پاکستانی ثقافت کے مسئلے کو ہم سیاسی سمجھنے کے بجائے یا ذاتی عناد اور علاقائی عصبیت کا مسئلہ بنائے بغیر اس پر علمی اور تہذیبی نقطۂ نظر سے غور اور تحقیق کریں۔ آج کی بحث سے مسئلہ حل نہیں ہوا لیکن اس کے راستے ہمارے سامنے ضرور آئے۔ خدا کرے، ہم ان راستوں پر عمل کر سکیں۔ ان راستوں میں سے سب سے اہم راستہ وہی ہے علمی راستہ۔ پہلے ہمیں ان چیزوں کا تعین کرنا ہے کہ ثقافت کا جو ورثہ ہم لے کر آئے تھے اور جس کو محفوظ رکھنے کے لیے ہم نے پاکستان بنایا تھا، اس کے عناصر کیا ہیں۔ اس کا تعین بے حد ضروری ہے کیوں کہ اسی اساس پر اس ثقافت کی بنیاد رکھی جائے گی جو مختلف علاقوں سے ہمیں ملے گی وہ ثقافت ہمیں بے حد عزیز ہے اور ان ثقافتوں کا جن کا ذکر آیا ہے، ان میں الگ الگ علاقوں میں ہونے کے باوجود مشترک عناصر ہیں۔ تحقیق کو ان مشترک عناصر کو یک جا کرنا ہے۔ ہمارے پچھلے تہذیبی ورثے کی بنیاد رکھی جائے گی جو مختلف علاقوں سے ہمیں ملے گی۔ وہ ثقافت ہمیں بے حد عزیز ہے۔ ہمارے پچھلے تہذیبی ورثے میں جو کچھ ہے، اسے یک جا کر کے اس طرح کے ادارے قائم کیے جائیں جو ان چیزوں کو مغربی اثرات سے بچا سکیں۔ جو ان چیزوں کو نئے سرے سے ان اخلاقی اقدار کے نقطۂ نظر سے جو ہماری ثقافت کا لازمی حصہ ہیں،

جو ان چیزوں کو مغربی اثرات کا کیسے مقابلہ کیا جائے جو ان چیزوں کو نئے سرے سے ان اخلاقی اقدار کے نقطۂ نظر سے جو ہماری ثقافت کا لازمی حصہ ہیں، جن پر کوئی گفتگو نہیں ہوئی۔ مختلف علاقوں کے مسلمانوں کا اخلاق ہے۔ ایک ہی طرح سلام کرتے ہیں، ایک ہی طرح جھک کے ملتے ہیں، وہی وضع داری، شرافت اور ایثار ہے۔ یہ چیزیں بھی زندگی میں اسی وقت داخل ہوئیں جب ہم یہ سوچنے لگے کہ یہ میراث ہیں، ہم کہیں باہر سے لے کر نہیں آئے۔ یہ یہیں موجود تھی۔ اس لیے موجود تھی کہ سرحد کا جو علاقہ ہے، پنجاب کا جو علاقہ ہے، وہ اسی مشترکہ تہذیب کا علاقہ تھا۔ جو مشترک ورثہ ملا ہے، اس کا کچھ نہ کچھ حصہ سرحد میں، سندھ میں، پنجاب میں پہلے سے موجود ہے۔ ان چیزوں کا سراغ تو ہمارے سامنے ہے۔ اب تحقیق اور علمی جستجو کو نیک نیتی اور اعلیٰ ظرفی کے ساتھ، قومی اعلیٰ ظرفی کے ساتھ اس اشتراک کی جستجو کرنی ہے اور اس کو عملی شکل دینے کے لیے اقدامات کرے۔ اب رہ گیا عملی اقدامات کا سوال کہ اُن کو رائج کیا جائے یا نہیں تو جیسا کہ فیض صاحب نے فرمایا ہے جب ہم سب اپنے آپ کو بہتر بنالیں گے تو یہ مسئلہ خود بخود حل ہو جائے گا، اس کا راستہ وہی ہے جو فیض صاحب اور آپ کی گفتگو نے معین کیا ہے۔

اس مجلس میں ایسی باتیں ہوئی ہیں جن کو اگر ہم گرہ سے باندھ لیں تو یقیناً مفید نتائج برآمد ہو سکتے ہیں۔